ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2965

Program: BS

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: اسلام کا نظام قضاء (2965) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ تخصص شریعہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (بونس: 5 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: اسلامی قانونِ شہادت کے اصول: سچائی، دیانت اور ثبوت کی بنیاد (20 نمبر)

سوال نمبر 1: اسلامی قانونِ شہادت عدالتی نظام کا اہم جزو ہے جو فیصلوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس میں سچائی اور دیانت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے اصول بیان کریں۔

(20 نمبر)

تعارف

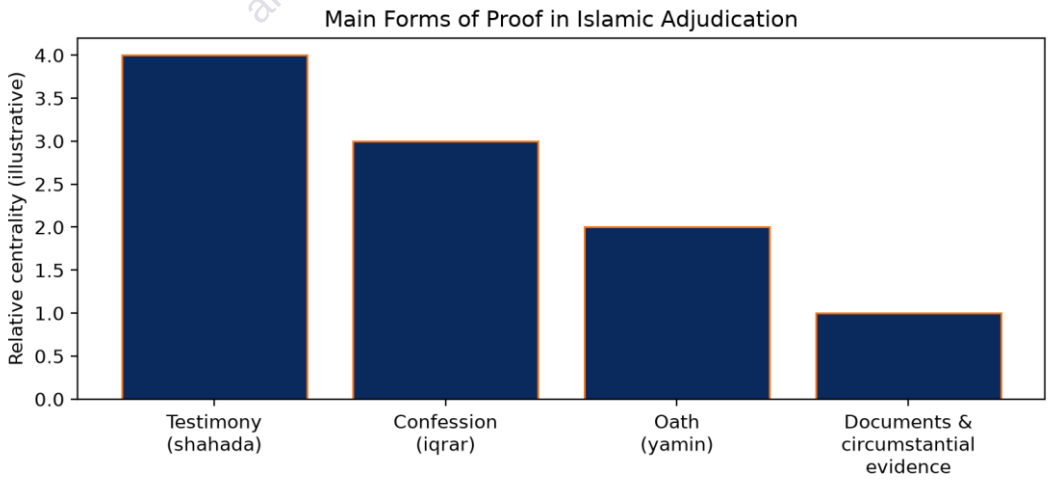
عدالتی فیصلہ اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب قاضی کے سامنے حقائق ثابت کرنے کا مضبوط نظام موجود ہو، اور اسلامی قانون میں اس نظام کی بنیاد شہادت یعنی گواہی ہے۔ قدیم زمانے سے آج تک بیشتر مقدمات میں اصل تنازعہ قانون کا نہیں بلکہ حقائق کا ہوتا ہے: فریقین واقعے کی الگ الگ صورتیں بیان کرتے ہیں اور قاضی کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس کا بیان درست ہے۔ شہادت اسی مسئلے کا حل ہے کہ بے طرف اور دیانت دار اشخاص کھلی عدالت میں وہ بیان کریں جو انہوں نے خود دیکھا یا سنا ہو۔ سوال میں اس نکتے پر زور دیا گیا ہے کہ اس قانون میں سچائی اور دیانت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ پورا فیصلہ گواہ کے کردار و صداقت پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس جواب میں شہادت کی تعریف و حیثیت، اس کی شرائط، گواہ کی صفات و تزکیہ، اقسام و دائرہ، جھوٹی گواہی کی سزا و مذمت، اور دیگر ذرائع ثبوت سے اس کے تعلق کو ترتیب وار بیان کیا جائے گا۔ یہ بحث خالص علمی مطالعہ ہے؛ کسی مقدمے میں گواہی کی قبولیت کا فیصلہ متعلقہ عدالت کا کام ہے۔

شہادت کی تعریف اور فقہی حیثیت

شہادت کے لغوی معنی حاضر ہونے اور یقینی علم حاصل کر کے خبر دینے کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مجلسِ قضاء میں، قاضی کے سامنے، مقررہ الفاظ و انداز میں کسی حق کے بارے میں وہ بات بیان کرے جو اس نے براہِ راست دیکھی یا سنی ہو، تاکہ اس کی بنیاد پر فیصلہ ہو سکے۔ شہادت کی حیثیت محض حق ہونے سے آگے بڑھ کر دینی ذمہ داری کی ہے: قرآن مجید نے گواہی کو حق کے لیے قائم رہنے کا حکم دیا ہے، گواہی چھپانے کو دل کے گناہ سے تعبیر کیا ہے، اور گواہوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے انصاف پر قائم رہیں خواہ گواہی اپنے یا قریبی عزیزوں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء شہادت کو امانت قرار دیتے ہیں اور قاضی کے طلب کرنے پر صاحبِ علم شخص کے لیے اسے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف جھوٹی شہادت کو اسلامی تعلیمات میں کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا اور اسے شرک و والدین کی نافرمانی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہادت کی سچائی اس قانون کی روح ہے اور اس کی حفاظت نظامِ انصاف کی حفاظت کے مترادف ہے۔

شہادت کی شرائط اور گواہ کی صفات

شہادت قابلِ قبول ہونے کے لیے فقہاء نے کئی شرائط مقرر کی ہیں جن کا مقصد بیان کی صداقت کو یقینی بنانا ہے۔ گواہ کے لیے عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے بیان کی ذمہ داری سمجھ سکے۔ واقعے کا براہِ راست مشاہدہ شرط ہے؛ سنی سنائی بات کو اصولاً شہادت نہیں مانا جاتا، البتہ بعض مخصوص صورتوں میں شہادت علی الشہادت کی محدود گنجائش فقہ میں بیان ہوئی ہے۔ بیان میں تعین و وضاحت بھی ضروری ہے کہ گواہ مبہم اشارے کے بجائے واضح بات کہے، اور اس کے بیان میں تضاد نہ ہو۔ سب سے اہم شرط عدالت ہے جس سے مراد گواہ کا دینی و اخلاقی طور پر قابلِ اعتماد ہونا ہے، یعنی وہ کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور مروت و دیانت کے تقاضوں کا پابند ہو۔ اس عدالت کو جانچنے کے لیے تزکیے کا نظام قائم ہوا جس میں قاضی گواہ کے محلے و جاننے والوں سے خفیہ و علانیہ تحقیق کرتا تھا، اور آج بھی کئی عدالتوں میں گواہ کی ساکھ کی جانچ اسی اصول کی جدید صورت ہے۔ گواہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس مقدمے میں اس کا ذاتی مفاد یا فریق سے دشمنی اس درجے کی نہ ہو جو اس کے بیان کو مشکوک کر دے، کیونکہ تہمت و مفاد کی موجودگی میں گواہی کی قبولیت پر فقہاء نے کڑی بحث کی ہے۔



خاکہ 1: اسلامی قضاء میں ثبوت کی اہم صورتیں

شہادت کی اقسام اور مختلف مقدمات میں اس کا دائرہ

شہادت کا دائرہ مقدمے کی نوعیت کے مطابق بدلتا ہے، اور اس تفریق سے بھی اس قانون کی احتیاط ظاہر ہوتی ہے۔ حدود و قصاص جیسے سنگین معاملات میں شہادت کی شرائط سب سے سخت ہیں، گواہوں کی تعداد وصفات میں زیادہ سختی ہے اور بیان میں معمولی شبہ بھی سزا کی راہ روک سکتا ہے۔ مالی معاملات و معاہدوں میں قرآن نے دو مردوں یا ایک مرد و دو عورتوں کی گواہی کی صورت بیان کر کے معاشرتی حالات کے مطابق ثبوت کا معیار مقرر کیا ہے، اور ساتھ ہی لین دین کو لکھنے اور گواہ بنانے کی ترغیب دی ہے تاکہ تنازعات پیدا ہی نہ ہوں۔ بعض ایسے امور جن کا مشاہدہ عام طور پر خواتین ہی کرتی ہیں ان میں خواتین کی گواہی کو مستقل طور پر قبول کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شہادت کے ضمن میں یہ اصول بھی بیان ہوا ہے کہ گواہی کی ذمہ داری حق دار کی مدد کے لیے ہے، لہٰذا قاضی گواہوں کو بلانے، ان کے بیانات الگ الگ سننے اور ان میں اختلاف ہونے پر ان کی تطبیق یا جانچ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ مکاتبِ فقہ کے درمیان گواہوں کی تعداد و قبولیت کی بعض جزئیات میں اختلاف ہے جو پچھلی مشق میں بیان شدہ تشریحی تنوع کا حصہ ہے، لیکن سچائی و عدالت کی شرط پر سب متفق ہیں۔

جدول 1: شہادت کے بنیادی اصولوں کا خلاصہ

مقصد	مفہوم	اصول
فیصلے کی درست بنیاد	واقعے کا عین وہی بیان جو دیکھا یا سنا گیا	سچائی
جھوٹ و جانبداری کی روک تھام	گواہ کا کردار و ساکھ قابلِ اعتماد ہو	دیانت و عدالت
افواہ کے بجائے یقینی علم	سنی سنائی بات شہادت نہیں	براہِ راست مشاہدہ
قبولیت سے پہلے تصدیق	قاضی کی طرف سے گواہ کی تحقیق	تزکیہ و جانچ
بے طرفی کی حفاظت	گواہ کا ذاتی فائدہ یا عناد نہ ہو	مفاد سے پاکیزگی

حق دار تک ثبوت کی رسائی	طلب پر گواہی پیش کرنا ذمہ داری	چھپانے کی ممانعت

جھوٹی گواہی، قسم اور دیگر ذرائعِ ثبوت سے تعلق

قانونِ شہادت کی حفاظت کے لیے جھوٹی گواہی پر سخت ردعمل رکھا گیا ہے: دینی اعتبار سے یہ کبیرہ گناہ ہے، اور قانونی اعتبار سے فقہاء نے جھوٹے گواہ کی تشہیر و تعزیری سزا اور اس کی آئندہ گواہی کی عدم قبولیت جیسی صورتیں بیان کی ہیں۔ اس سختی کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹی گواہی سے بے گناہ کو سزا اور ناجائز کو حق مل سکتا ہے، یعنی یہ انصاف کی بنیاد ہی کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ شہادت کے ساتھ ثبوت کی دیگر صورتیں بھی اسی نظام کا حصہ ہیں: مدعا علیہ کا اقرار سب سے مضبوط دلیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ عقل مند شخص اپنے خلاف جھوٹ نہیں بولتا سمجھا جاتا، جہاں ثبوت ناقص ہو وہاں فریق سے قسم لینا فیصلے کا پرانا و مستعمل ذریعہ ہے، اور تحریری دستاویزات و قرائن کو بھی فقہاء نے اپنے اپنے اصولوں کے مطابق اہمیت دی ہے۔ یوں شہادت اکیلی صورت نہیں بلکہ ایک منظم قانونِ ثبوت کا مرکز ہے جس میں ہر ذریعے کو اس کی نوعیت کے مطابق مقام دیا گیا ہے، اور یہی توازن قاضی کو اندھے اعتماد اور بے جا شک دونوں سے بچاتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ شہادت فیصلوں کی وہ بنیاد ہے جو گواہ کی سچائی، عدالت و دیانت، براہِ راست مشاہدے، تزکیے کی جانچ اور مفاد سے پاکیزگی جیسی شرائط پر قائم ہے۔ مقدمے کی سنگینی کے مطابق اس کی شرائط سخت یا نسبتاً نرم ہوتی ہیں، جھوٹی گواہی کو دینی و قانونی دونوں سطحوں پر شدید جرم سمجھا گیا ہے، اور شہادت اقرار، قسم و دستاویز کے ساتھ مل کر ایک مکمل قانونِ ثبوت بناتی ہے۔ اس نظام کا مرکزی سبق یہ ہے کہ انصاف کا آغاز عدالت کے کمرے سے نہیں بلکہ معاشرے کے افراد کی سچائی سے ہوتا ہے؛ جب گواہ دیانت دار ہوں تو قاضی کا کام حق تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ طالب علم کو نوٹ کرنا چاہیے کہ یہ اصول علمی مطالعے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور ان کے عملی اطلاق و فیصلے کا اختیار عدالتوں اور اہلِ علم کا ہے۔

سوال نمبر 2: حدود کے نفاذ کی سخت شرائط اور تحفظِ بے گناہ (20 نمبر)

سوال نمبر 2: حدود کے نفاذ کے لیے سخت شرائط مقرر کی گئی ہیں تاکہ کسی بے گناہ کو سزا نہ ہو۔ یہ اصول انصاف کو یقینی بناتے ہیں۔ ان شرائط کی وضاحت کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

حدود سے مراد وہ متعین سزائیں ہیں جو اسلامی قانون میں بعض مخصوص جرائم کے لیے شریعت کی طرف سے مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت سنگین ہے اور ان میں قاضی کو کمی بیشی کا اختیار حاصل نہیں، اسی لیے ان کے ثبوت و نفاذ کے گرد شرائط و حفاظات کا ایک غیر معمولی سخت نظام قائم کیا گیا ہے۔ سوال کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ یہ سختی سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ بے گناہ کو بچانے کے لیے ہے: جرم اس درجے یقین سے ثابت ہو کہ شبہے کی گنجائش نہ رہے، ورنہ سزا نہیں دی جائے گی۔ مشہور فقہی قاعدہ اسی کی تعبیر ہے کہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ اس جواب میں پہلے حد کی تعریف و دائرہ، پھر نفاذ کی عمومی شرائط، پھر ثبوت کی حصری سختی، پھر شبہے کی اقسام و اثر، اور آخر میں ان شرائط کے پس پردہ انصاف و حکمت کو بیان کیا جائے گا۔ یہ سارا مطالعہ خالص علمی و فقہی ہے؛ حدود کا نفاذ ہر دور میں صرف ریاست و عدالت کا اختیار رہا ہے اور کسی فرد یا گروہ کو اس کا کوئی اختیار نہیں، اسی طرح کسی معاصر معاملے میں شرائط کے اطلاق کا فیصلہ بھی صرف متعلقہ عدالت و مستند اہلِ علم کا کام ہے۔

حد کی تعریف، دائرہ اور بنیادی نوعیت

لغت میں حد روک اور آخری سرے کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں حد وہ متعین سزا ہے جو کسی مخصوص جرم پر اللہ کے حق کے طور پر مقرر کی گئی ہو۔ فقہی کتب میں عموماً جن جرائم کو حدود میں شمار کیا جاتا ہے ان میں زنا، قذف یعنی کسی پاک دامن پر جھوٹی تہمت، چوری، ڈاکا و رہزنی، شراب نوشی اور بعض کے نزدیک ارتداد و بغاوت کی مخصوص صورتیں شامل ہیں، البتہ ہر جرم کی دقیق تعریف و شرائط میں مکاتب کے درمیان تفصیلی اختلاف ہے۔ حد کی دو نوعیتیں سمجھنا ضروری ہیں: ایک یہ کہ یہ سزا معین ہے اس لیے قاضی یا حکمران اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا، اور دوسری یہ کہ یہ حق اللہ سمجھی جاتی ہے اس لیے متاثرہ فرد اسے معاف کر کے ساقط نہیں کر سکتا، عدالت تک معاملہ پہنچنے کے

بعد صلح و سفارش کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ انھی دو نوعیتوں کی وجہ سے ثبوت کا معیار سب سے اونچا رکھا گیا ہے؛ کیونکہ جہاں انسانی اختیار کم ہو وہاں انسانی غلطی کی گنجائش بھی کم سے کم رکھنا انصاف کا تقاضا ہے۔ اسی اصول پر پورا شرائط کا نظام قائم ہے۔

نفاذ کی عمومی شرائط

حد کے نفاذ سے پہلے کئی عمومی شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ مرتکب کے لیے عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، کیونکہ دیوانے و نابالغ پر تکلیف ہی نہیں اس لیے حد بھی نہیں۔ عمل کا ارتکاب اپنے اختیار و ارادے سے ہوا ہو؛ جس شخص کو جبراً کسی فعل پر مجبور کیا گیا ہو اس پر حد جاری نہیں ہوتی، کیونکہ اکراہ ارادے کو ختم کر دیتا ہے۔ مرتکب کو اس فعل کی حرمت کا علم یا کم از کم ایسے ماحول میں ہونا جس میں جہالت کا عذر قابلِ قبول نہ ہو، یہ نکتہ بھی فقہی بحث میں آتا ہے۔ جرم کا ارتکاب دار الاسلام و عدالت کے دائرے میں ہونا اور مقدمے کا باقاعدہ عدالت کے سامنے ثابت ہونا بھی شرط ہے؛ خود سے سزا دینا کسی صورت جائز نہیں۔ اس کے علاوہ بعض حدود میں مال یا شخص سے متعلق اضافی شرائط بھی ہیں، مثلاً چوری کی حد کے لیے مال کا مقررہ نصاب تک پہنچنا، اس کا محفوظ جگہ سے چرایا جانا اور اس میں چور کا کوئی ملکیت کا شبہ نہ ہونا شرط ہے؛ ان میں سے کوئی ایک بھی شرط کم ہو تو حد ساقط ہو کر معاملہ زیادہ سے زیادہ تعزیر کے دائرے میں رہ جاتا ہے۔

ثبوت کی خصوصی شرائط و سختی

حدود میں ثبوت کی شرائط اسلامی قانونِ ثبوت کا سخت ترین حصہ ہیں۔ گواہوں کی تعداد عام معاملات سے زیادہ رکھی گئی ہے؛ زنا جیسے جرم میں چار عادل مرد گواہوں کا عین واقعے پر متفق بیان شرط ہے، جو عملی طور پر ثبوت کا انتہائی اونچا معیار ہے، اور ان گواہوں کے بیان میں اختلاف یا کمی کی صورت میں حد ثابت نہیں ہوتی بلکہ غلط الزام لگانے والوں پر خود قذف کی حد کی بحث آ جاتی ہے۔ گواہوں کا عادل و قابلِ اعتماد ہونا، ان کا بیان مجلس میں واضح و غیر مبہم ہونا، اور گواہی میں تاخیر یا رجوع کی صورتوں کے احکام یہ سب اسی سختی کا حصہ ہیں۔ اقرار کی صورت میں بھی شرائط رکھی گئی ہیں کہ اقرار کرنے والا عاقل و بالغ ہو، اقرار واضح ہو اور بعض جرائم میں اقرار سے رجوع حد کو ساقط کر دیتا ہے، بلکہ

فقہاء نے قاضی کے لیے یہاں تک مناسب سمجھا ہے کہ وہ اقرار کرنے والے کو رجوع کی گنجائش کا اشارہ دے تاکہ شبہے کی صورت میں سزا نہ ہو۔ قاضی کو یہ اختیار و ذمہ داری بھی دی گئی ہے کہ وہ ثبوت کی ہر کڑی کی تحقیق کرے اور جہاں یقین مکمل نہ ہو وہاں حد روک دے۔

جدول 2: حدود کے نفاذ کی شرائط کی حفاظتی منطق

بے گناہ کا تحفظ	مفہوم	شرط
نابالغ و مجنون سزا سے محفوظ	مرتکب مکلف و سمجھ دار ہو	عقل و بلوغ
مجبور شخص پر سزا نہیں	فعل اپنے ارادے سے ہو	اختیار و عدمِ اکراہ
ملتی جلتی ہلکی صورت حد سے خارج	نصاب، حرز و دیگر قیود پوری ہوں	جرم کی مکمل تعریف
غیر یقینی الزام پر سزا ناممکن	مقررہ تعداد کے عادل گواہ یا صریح اقرار	سخت ثبوت
شبہ ہوتے ہی حد ساقط	ملکیت، نکاح یا ثبوت کا شبہ موجود نہ ہو	شبہے کا اعتبار
نجی انتقام و خود انصافی کا خاتمہ	صرف عدالت و ریاست کے ذریعے نفاذ	عدالتی کارروائی

شبہے کا اصول اور اس کی اقسام

حدود کے نظام کا سب سے مشہور حفاظتی اصول شبہے کا اعتبار ہے۔ فقہاء نے شبہے کی کئی صورتیں بیان کی ہیں: شبہہ ملکیت، جیسے کوئی شخص کسی مال میں خود کو کسی درجے شریک یا حق دار سمجھ کر اسے لے لے؛ شبہہ عقد، جیسے کسی خامی دار نکاح کی بنیاد پر تعلق کو جائز سمجھ لیا گیا ہو؛ شبہہ فعل، جیسے حرمت کا علم نہ ہونے کی معتبر صورت؛ اور شبہہ ثبوت، جیسے گواہوں کے بیان میں اختلاف یا ان کی عدالت مشکوک ہو۔ ان میں سے کوئی سا شبہ بھی ثابت ہو جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے، البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فعل حلال ہو جاتا ہے یا مرتکب ہر سزا سے بچ جاتا ہے؛ دینی گناہ اپنی جگہ رہتا ہے اور حالات کے مطابق تعزیری کارروائی کی گنجائش بھی فقہ میں موجود ہے، صرف متعین حد نافذ نہیں ہوتی۔ اس

اصول کی حکمت یہ ہے کہ سنگین و ناقابلِ واپسی سزا کے لیے یقین کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہونا چاہیے، اور غلط سزا سے بچنا مجرم کے چھوٹ جانے سے زیادہ اہم سمجھا گیا ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جسے جدید قانون میں بھی شک کا فائدہ ملزم کو دینے کے اصول کی صورت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان شرائط کی حکمت اور انصاف سے تعلق

ان سخت شرائط کی حکمت پر غور کیا جائے تو کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ پہلی حکمت انسانی جان و عزت کی حرمت ہے: اتنی بھاری سزا اسی وقت روا ہے جب جرم ہر شبہے سے پاک ثابت ہو۔ دوسری حکمت یہ کہ حدود کا مقصد صرف سزا دینا نہیں بلکہ جرم کی روک تھام و معاشرے کو خوف دلانا بھی ہے؛ مقررہ سزا کا اعلان و اس کی سنجیدگی معاشرتی سطح پر رکاوٹ کا کام کرتی ہے، جبکہ عملی نفاذ کی راہ میں رکھی گئی سختیاں اسے نایاب واقعہ بناتی ہیں۔ تیسری حکمت نظامِ انصاف پر اعتماد ہے: لوگ جب دیکھتے ہیں کہ عدالت کسی کو ناقص ثبوت پر سزا نہیں دیتی تو ان کا اعتماد عدالت پر بڑھتا ہے اور الزام تراشی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، مخصوص طور پر قذف کی حد اسی مقصد کے لیے ہے کہ عزتوں پر الزام کھیل نہ بنے۔ چوتھی حکمت توبہ و اصلاح کی گنجائش ہے؛ عدالت تک معاملہ پہنچنے سے پہلے توبہ و رجوع کی ترغیب اور اقرار سے رجوع کی قبولیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ نظام کی ترجیح انسان کی اصلاح ہے، سزا اس کا آخری مرحلہ ہے۔ ان حکمتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو شرائط کی سختی کمزوری نہیں بلکہ اس نظام کی سب سے مضبوط انصافی پہچان نظر آتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حدود کے نفاذ کے لیے مرتکب کی اہلیت، عمل کا ارادی ہونا، جرم کی تعریف کی تمام قیود کا پورا ہونا، مقررہ معیار کا سخت و یقینی ثبوت اور ہر قسم کے شبہے کی غیر موجودگی شرط ہے؛ ان میں کمی ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ شرائط بیک وقت تین مقاصد پورے کرتی ہیں: بے گناہ کی حفاظت، الزام تراشی کی روک تھام اور عدالت پر عوامی اعتماد۔ ایک بار پھر واضح رہے کہ یہ بیان فقہی اصولوں کا علمی مطالعہ ہے؛ حدود کے نفاذ کا اختیار صرف ریاست و عدالت کو ہے اور ان شرائط کے اطلاق کا فیصلہ صرف اہل عدالت و مستند علماء کا کام ہے، کسی طالب علم یا عام فرد کا نہیں۔ طالب علم کے لیے اس سوال کا اصل سبق یہ ہے کہ اسلامی قانون میں سزا کی شدت کے ساتھ ثبوت کی شدت بھی اسی تناسب سے رکھی گئی ہے، اور انصاف کا یہی توازن اس نظام کی روح ہے۔

سوال نمبر 3: قصاص و دیت کے قوانین: توازن، انصاف اور متاثرہ فریق کا حق (20 نمبر)

سوال نمبر 3: قصاص و دیت کے قوانین اسلامی قانون میں توازن اور انصاف قائم کرتے ہیں۔ یہ متاثرہ فریق کو حق فراہم کرتے ہیں۔ ان قوانین کو بیان کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

انسانی جان اور جسمانی سلامتی کے خلاف جرائم ہر قانونی نظام کے سنگین ترین مسائل میں سے ہیں۔ اسلامی قانون میں جان و اعضاء کے جرائم کا بنیادی ضابطہ قصاص و دیت ہے: قصاص سے مراد جرم کے برابر بدلہ یعنی قاتل کو اس کے جرم کی سزا میں قتل کیا جانا یا مجروح عضو کے بالمقابل یہی عمل، اور دیت سے مراد متعین مالی معاوضہ ہے جو متاثرہ فریق یا اس کے وارثوں کو دیا جاتا ہے۔ سوال میں دو نکات نمایاں کیے گئے ہیں: یہ قوانین توازن و انصاف قائم کرتے ہیں، اور یہ متاثرہ فریق کو باقاعدہ حق فراہم کرتے ہیں، یعنی معاملہ صرف ریاست و مجرم کے درمیان نہیں رہتا بلکہ جس کو نقصان پہنچا ہے اس کی مرضی و حق کو نظام میں مرکزی جگہ دی گئی ہے۔ اس جواب میں قصاص کی تعریف و شرائط، دیت کی تعریف و صورتیں، معافی و صلح کا حق، اور ان قوانین کے اندر توازن و حکمت کو بیان کیا جائے گا۔ یہ بھی پیشگی واضح رہے کہ یہ خالص فقہی مطالعہ ہے؛ قصاص و دیت کے کسی بھی معاملے کا فیصلہ و نفاذ صرف عدالت و ریاست کا اختیار ہے اور اس کا اطلاق اہلِ علم و عدالت کا کام ہے۔

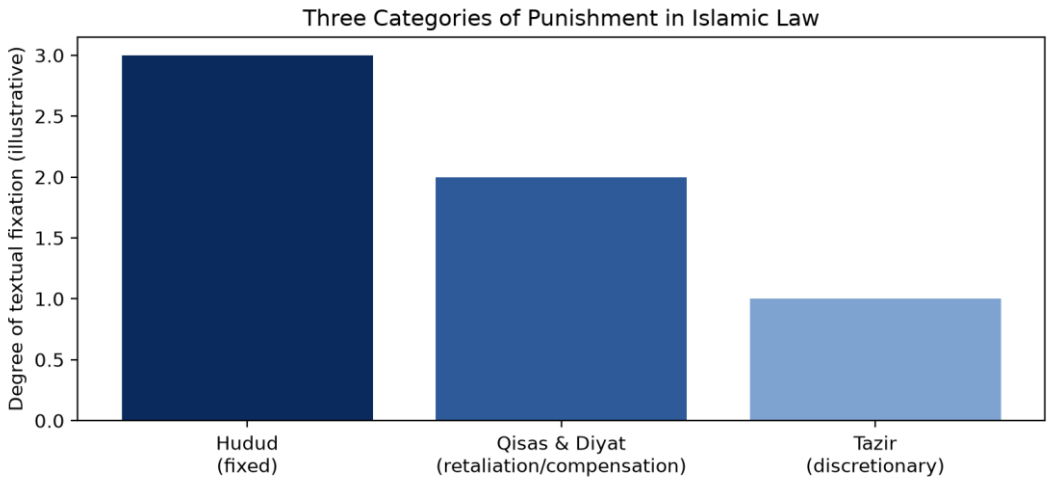
قصاص کی تعریف اور اس کی شرائط

قصاص کے لفظی معنی نشان کے پیچھے چلنا اور برابر بدلہ لینا ہیں۔ اصطلاح میں قصاص اس سزا کو کہتے ہیں جس میں جان یا عضو کے جرم میں مجرم کے ساتھ وہی کیا جاتا ہے جو اس نے کیا تھا۔ قرآن مجید نے جان کے بدلے جان اور عضو کے بدلے عضو کا اصول بیان کیا ہے اور ساتھ ہی قصاص کو معاشرے کے لیے زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے، کیونکہ قاتل کو معلوم ہو کہ اس کا انجام وہی ہو گا جو اس نے دوسرے کے ساتھ کیا، تو قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔ قصاص واجب ہونے کے لیے فقہاء نے سخت شرائط رکھی ہیں: قتل یا جرح عمداً اور عدواناً ہوا ہو، مقتول معصوم الدم یعنی قانونی تحفظ رکھنے والا ہو، قاتل عاقل و بالغ و مکلف ہو، اور قتل کا ثبوت مقررہ معیار پر پورا ہو، ورنہ شبہے کی صورت میں قصاص ساقط

ہو جاتا ہے۔ اعضاء کے قصاص میں برابری کی مکمل رعایت اور زیادتی کے خطرے کی عدم موجودگی بھی شرط ہے؛ جہاں برابر بدلہ ممکن نہ ہو یا اس میں تجاوز کا اندیشہ ہو وہاں قصاص کے بجائے دیت یا ارش کی طرف جایا جاتا ہے۔ ان شرائط سے ظاہر ہے کہ قصاص انتقام کا جذباتی نام نہیں بلکہ سخت ضوابط میں بندھی ہوئی قانونی سزا ہے۔

دیت کی تعریف، مقدار کا تصور اور اقسام

دیت سے مراد وہ مقررہ مال ہے جو جان تلف ہونے یا عضو کے ضائع ہونے کی صورت میں مجرم یا اس کے عاقلہ کی طرف سے متاثرہ فریق یا وارثوں کو دیا جاتا ہے۔ کلاسیکی فقہ میں نفس کی مکمل دیت کی مشہور مقدار سو اونٹ یا اس کے مساوی مقررہ رقم بیان ہوئی ہے، جبکہ اعضاء کی دیت اسی تناسب سے طے ہوتی ہے: جو عضو جوڑے میں ہو اس کے ایک میں نصف دیت، دونوں میں پوری دیت، اور چھوٹی چھوٹی چوٹوں کے لیے ارش یعنی قاضی کے تقدیر کردہ معاوضے کا نظام ہے۔ دیت کی صورتیں جرم کی نوعیت سے جڑی ہیں: قتلِ خطا یعنی غلطی سے قتل میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی لازمی قرار دیا گیا ہے، قتلِ عمد میں اصل سزا قصاص ہے مگر معافی یا صلح کی صورت میں دیت ادا ہوتی ہے، اور شبہِ عمد جیسی درمیانی صورتوں میں بھی دیت ہی کا حکم آتا ہے۔ بعض صورتوں میں دیت کی ادائیگی کا بوجھ مجرم کے عاقلہ یعنی اس کے قریبی مرد رشتہ داروں یا اجتماعی ذمہ داری رکھنے والے گروہ پر تقسیم کیا جاتا ہے، جس سے دو فائدے ہوتے ہیں: متاثرہ خاندان کو معاوضہ ملنا یقینی ہو جاتا ہے اور مجرم کے پورے خاندانی نظام پر اجتماعی نگرانی کا دباؤ بنتا ہے۔ جدید ریاستوں میں دیت کی رقم کا تعین قانون و عدالت کے ذریعے مقامی کرنسی و حالات کے مطابق کیا جاتا ہے۔



خاکہ 2: اسلامی قانون میں سزاؤں کی تین بڑی اقسام

معافی و صلح: متاثرہ فریق کے حق کی اصل صورت

قصاص و دیت کے نظام کی سب سے منفرد خصوصیت متاثرہ فریق کو حاصل معافی و صلح کا حق ہے۔ قتلِ عمد میں مقتول کے وارثوں کو تین راستے حاصل ہوتے ہیں: قصاص کا مطالبہ کریں، دیت پر صلح کر لیں، یا خالص اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دیں۔ قرآن مجید نے معافی کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور اس کے بدل اجر کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ معافی وارثوں کی آزادی ہے، ان پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا؛ اگر وہ قصاص پر اصرار کریں تو عدالت اس کا فیصلہ کرے گی۔ اس حق نے کئی بڑے سماجی فائدے پیدا کیے ہیں: متاثرہ خاندان کو یہ احساس ملتا ہے کہ نظام نے ان کے غم و حق کو تسلیم کیا ہے، معافی و صلح کی صورت میں خاندانوں کے درمیان نسلوں تک چلنے والی دشمنیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور دیت کی صورت میں یتیموں و بیوہ کے لیے معاشی سہارا فراہم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جہاں سزا صرف ریاست کا حق ہوتی ہے وہاں متاثرہ فریق خود کو عمل سے باہر محسوس کرتا ہے۔ البتہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ معافی یا دیت کے باوجود عدالت مجرم کو امنِ عامہ کے پیشِ نظر مناسب تعزیری سزا دے سکتی ہے، تاکہ نجی تصفیے سے معاشرتی نظم متاثر نہ ہو؛ فقہاءِ جدید قوانین دونوں میں اس توازن کی صورتیں موجود ہیں۔

جدول 3: جان و اعضاء کے جرائم میں قصاص و دیت کی صورتیں

صورت	بنیادی حکم	متاثرہ فریق کا حق
قتلِ عمد	قصاص	قصاص کا مطالبہ، دیت پر صلح، یا معافی
قتلِ شبہ عمد	دیتِ مغلظہ و کفارہ	دیت کا حصول؛ صلح کی گنجائش
قتلِ خطا	دیت و کفارہ	وارثوں کو معاوضہ؛ معافی ممکن
جرحِ عمد	ممکن ہونے پر عضو کا قصاص	معافی یا ارش و دیت پر صلح

نقصان کے تناسب سے معاوضہ	دیت یا ارش	جرحِ خطا

توازن و انصاف: ان قوانین کی حکمت

ان قوانین میں توازن کئی جہتوں سے نظر آتا ہے۔ پہلا توازن مجرم کے درمیان ہے: بدلہ جرم سے بڑھ نہیں سکتا، ایک جان کے بدلے ایک ہی جان ہے، اور زیادتی کو قرآن نے صراحتاً منع کیا ہے؛ یوں قدیم قبائلی رواج جس میں ایک قتل کے بدلے کئی جانیں ہوتے تھے ختم ہو گیا۔ دوسرا توازن مجرم و متاثرہ کے حقوق کے درمیان ہے: مجرم کو سخت شرائط و ثبوت کی حفاظت حاصل ہے، اور متاثرہ کو مطالبہ، صلح و معافی کا حق۔ تیسرا توازن انفرادی حق و سماجی مفاد کے درمیان ہے: اصل حق فرد کا ہے مگر اس کا نفاذ ریاست و عدالت کے ذریعے ہوتا ہے، اس لیے نجی انتقام کا راستہ بند ہے اور فساد نہیں پھیلتا۔ چوتھا توازن دنیوی و اخروی پہلوؤں کے درمیان ہے: دیت معاشی نقصان کی تلافی کرتی ہے اور معافی کی ترغیب اخلاقی بلندی پیدا کرتی ہے۔ اسی مجموعی توازن کو قرآن کے اس ارشاد کا مصداق سمجھا جاتا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے، کیونکہ قصاص کا یقینی خوف قتل روکتا ہے، دیت متاثرہ خاندان کو جینے کا سہارا دیتی ہے، اور معافی کا دروازہ دشمنیوں کا خاتمہ کر کے نئی زندگی دیتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قصاص جان و عضو کے جرائم میں برابری کی قانونی سزا ہے جو سخت شرائط و ثبوت کے بعد عدالت کے ذریعے نافذ ہوتی ہے، اور دیت اسی نظام کا مالی معاوضے والا پہلو ہے جو قتلِ خطا و شبہ عمد میں اصلاً اور قتلِ عمد میں صلح و معافی کی صورت میں وارثوں کو ملتی ہے۔ متاثرہ فریق کو قصاص، صلح یا معافی میں سے انتخاب کا حق دے کر ان قوانین نے انصاف کو صرف ریاستی عمل کے بجائے انسانی حق کی تکمیل بنا دیا ہے، اور برابری کی حد، نجی انتقام کی ممانعت و تعزیر کی گنجائش نے اس حق کو توازن میں رکھا ہے۔ طالب علم کو دہرانا چاہیے کہ ان احکام کا اطلاق و نفاذ صرف عدالت و ریاست کا کام ہے اور کسی شک و شبہ کی صورت میں مستند علماء و عدالت ہی سے رجوع کرنا چاہیے؛ اس جواب کا مقصد ان قوانین کی فقہی ساخت و حکمت کو علمی طور پر سمجھنا ہے۔

سوال نمبر 4: تعزیری سزاؤں کے مقاصد اور ان میں لچک کا اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 4: تعزیری سزائیں معاشرتی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے دی جاتی ہیں اور ان میں حالات کے مطابق لچک موجود ہوتی ہے۔ ان کے مقاصد واضح کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

اسلامی قانونِ سزا کی تیسری بڑی قسم تعزیر ہے۔ حدود و قصاص چند مخصوص جرائم کے لیے مقرر ہیں، لیکن انسانی معاشرے میں جرائم و نافرمانیوں کی بے شمار ایسی صورتیں پیش آتی ہیں جن کے لیے شریعت نے کوئی متعین سزا نہیں رکھی، مثلاً چھوٹی چوری جو حد کے نصاب کو نہ پہنچے، گالی گلوچ، مار پیٹ کی ہلکی صورتیں، دھوکا دہی، ناپ تول میں کمی، سرکاری فرائض میں کوتاہی اور امنِ عامہ کو نقصان پہنچانے والی حرکات۔ اگر ان کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی تو معاشرتی نظم قائم نہ رہتا، اور اگر ان سب کے لیے ایک ہی سخت سزا مقرر ہوتی تو وہ عدم تناسب کا شکار ہوتی۔ تعزیر اسی خلا کو پر کرتی ہے: یہ وہ سزا ہے جس کی نوعیت و مقدار قاضی حالات، جرم کی سنگینی اور مجرم کی حالت دیکھ کر متعین کرتا ہے۔ اس جواب میں تعزیر کی تعریف و دائرہ، اس کی لچک کی صورتیں، اور تفصیل سے اس کے مقاصد بیان کیے جائیں گے۔ یہ مطالعہ علمی ہے؛ تعزیری سزا کا فیصلہ بھی صرف عدالت کا اختیار ہے۔

تعزیر کی تعریف، دائرہ اور صورتیں

تعزیر کے لفظی معنی روکنا، ادب سکھانا اور تنبیہ کرنا ہیں۔ اصطلاح میں تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو ایسے گناہ یا جرم پر دی جائے جس کی متعین حد یا کفارہ شریعت میں مقرر نہ ہو، اور جس کی مقدار و نوعیت کا تعین قاضی یا حکمران کے اختیار میں چھوڑا گیا ہو۔ تعزیر کا دائرہ دو قسم کے افعال پر پھیلا ہوا ہے: ایک وہ معاصی جن کی حد مقرر نہیں، اور دوسرے وہ معاملات جہاں حد کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے حد ساقط ہو جائے، مثلاً نصاب سے کم چوری؛ وہاں مجرم کو بالکل چھوڑنے کے بجائے تعزیر دی جاتی ہے تاکہ نہ نظام انصاف ناکام ہو اور نہ سخت سزا غیر متناسب طور پر نافذ ہو۔ تعزیر کی صورتیں فقہی کتب میں درجہ وار بیان ہوئی ہیں: وعظ و نصیحت اور سرزنش سے لے کر ڈانٹ، جرمانہ، قید،

کوڑے، عہدے سے معزولی اور عوامی تنبیہ تک، اور قاضی مجرم کی حیثیت و جرم کی نوعیت کے مطابق ان میں سے مناسب درجہ منتخب کرتا ہے۔ یہ تنوع ہی وہ بنیاد ہے جس پر تعزیر کی لچک قائم ہے اور جس سے یہ نظام ہر دور کے نئے جرائم، مثلاً مالی فراڈ یا سائبر نوعیت کی ہر اسانی، کو بھی اصولاً اپنے دائرے میں سمو سکتا ہے۔

لچک کا اصول: کس کس پہلو میں؟

تعزیر کی لچک کئی پہلوؤں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی لچک جرم کے لحاظ سے ہے: ایک ہی عنوان کے جرم کی سنگینی حالات سے بدل جاتی ہے، مثلاً معمولی دھوکا اور منظم بڑا فراڈ ایک درجے کی سزا کے مستحق نہیں، اور قاضی یہ فرق کر سکتا ہے۔ دوسری لچک مجرم کے لحاظ سے ہے: پہلی بار غلطی کرنے والا، عادی مجرم، نوجوان، یا سماجی طور پر ذمہ دار عہدے پر فائز شخص، ان سب کے لیے ایک ہی سزا موزوں نہیں ہوتی؛ بعض صورتوں میں ایک معزز شخص کے لیے محض شرمندگی و سرزنش ہی کافی اصلاح کر دیتی ہے جبکہ عادی مجرم کے لیے قید ضروری ہوتی ہے۔ تیسری لچک زمان و مکان کے لحاظ سے ہے: جس جرم کا رجحان کسی دور یا علاقے میں بڑھ جائے اس کی تعزیر سخت ہو سکتی ہے تاکہ روک تھام مؤثر ہو۔ چوتھی لچک سزا کی نوعیت میں ہے: قاضی تنبیہ، مال، قید یا جسمانی سزا میں سے وہ صورت چنتا ہے جو اس معاملے میں سب سے زیادہ اصلاحی ہو۔ البتہ یہ لچک لامحدود اختیار نہیں؛ فقہاء نے اس کی حدیں بھی مقرر کی ہیں، مثلاً تعزیر اصولاً حد کی مقدار سے تجاوز نہ کرے، سزا میں اہانت و اذیت کی ممنوع صورتیں نہ ہوں، اور فیصلہ ذاتی پسند کے بجائے واضح وجوہ پر مبنی ہو۔

تعزیر کے مقاصد: اصلاح، روک تھام اور نظم

تعزیر کا پہلا مقصد مجرم کی اصلاح و تادیب ہے۔ لفظ تعزیر کی اصل ہی ادب سکھانے پر دلالت کرتی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا کا ہدف مجرم کو تباہ کرنا نہیں بلکہ اسے دوبارہ اسی فعل سے روک کر معاشرے کا مفید فرد بنانا ہے؛ اسی لیے قاضی سب سے ہلکی مؤثر سزا سے آغاز کرتا ہے اور اصلاح ہو جانے پر نرمی کرتا ہے۔ دوسرا مقصد روک تھام ہے جو دو درجوں میں کام کرتی ہے: خود مجرم کے لیے خاص روک تھام کہ وہ جرم دہرائے نہیں، اور عام لوگوں کے لیے عام روک تھام کہ وہ سزا دیکھ کر اس راستے سے بچیں۔ تیسرا مقصد معاشرتی نظم و ضبط کی حفاظت ہے: بازار کے جرائم، سرکاری فرائض کی خلاف ورزیاں، امنِ عامہ کی خرابیاں اور حقوق العباد کی چھوٹی خلاف ورزیاں اگر سزا سے خالی

رہ جائیں تو آہستہ آہستہ پورا نظام اعتماد کھو دیتا ہے؛ تعزیر اس خلا کو پر کر کے قانون کی عمومی پاسداری برقرار رکھتی ہے۔ چوتھا مقصد متاثرہ فریق کی دادرسی و تلافی بھی ہے، جہاں تک ممکن ہو، جیسے مال کی واپسی و نقصان کی بھرپائی کو تعزیر کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ پانچواں مقصد حدود و قصاص کے نظام کی تکمیل ہے: جہاں شبہے سے حد رک جائے وہاں تعزیر یہ پیغام دیتی ہے کہ قانون خاموش نہیں ہوا بلکہ تناسب کے ساتھ عمل میں آیا ہے۔

جدول 4: تعزیر کے مقاصد اور ان کی عملی صورتیں

عملی صورت	مفہوم	مقصد
نصیحت سے قید تک درجہ وار سزا	مجرم کا رویے کی درستگی	اصلاح و تادیب
حالات کے مطابق مؤثر مقدار	اسی مجرم کا جرم نہ دہرانا	خاص روک تھام
علانیہ و متناسب سزا	دوسروں کے لیے عبرت	عام روک تھام
بازار، دفتر و امنِ عامہ کے جرائم کی سزا	قانون کی عمومی پاسداری	نظم و ضبط
مال کی واپسی و معاوضے کی ہدایت	متاثرہ کے نقصان کی تلافی	دادرسی
شبہے والے مقدمات میں متناسب تعزیر	حد رک جانے پر قانونی خلا نہ رہنا	تکمیلِ نظام

حدود و قصاص سے تعزیر کا فرق اور باہمی تعلق

تینوں اقسام کے فرق کو سمجھنا اس سوال کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ حد متعین ہے اور اس میں قاضی کا اختیار ثبوت کی جانچ تک محدود ہے؛ قصاص میں متاثرہ فریق کا حق مرکزی ہے اور معافی و صلح کی گنجائش موجود ہے؛ جبکہ تعزیر میں سزا کا تعین قاضی کے صوابدیدی اختیار میں ہے اور اسی اختیار کی وجہ سے اس میں زمانے و حالات کی رعایت سب سے زیادہ ہے۔ اس فرق کے باوجود یہ تینوں ایک ہی نظام کے حصے ہیں اور ان کی تقسیم ایک حکمت رکھتی ہے: جن جرائم میں انسانی اختیار کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک

ہو سکتی تھی وہاں سزا متعین کر کے ثبوت سخت کر دیا گیا، اور جہاں حالات کی تبدیلی زیادہ تھی وہاں نظام نے قاضی کو منضبط اختیار دیا تاکہ قانون جامد نہ ہو۔ جدید دنیا کے بیشتر قوانین میں بھی یہی دوہرا ڈھانچہ موجود ہے کہ بڑے جرائم کی سزائیں قانون میں مقرر ہوتی ہیں اور چھوٹے و متنوع جرائم میں جج کو ایک حد کے اندر صوابدید حاصل ہوتی ہے، جو تعزیر کے اصول سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعزیری سزائیں ان تمام جرائم و نافرمانیوں کے لیے قاضی کی طرف سے [illegible] سب سزائیں ہیں جن کی متعین حد مقرر نہیں، یا جن میں حد کی شرائط پوری نہ ہوئی ہوں۔ ان کی لچک جرم، مجرم، زمان و مکان اور سزا کی نوعیت سب میں پائی جاتی ہے، مگر یہ لچک مقصدی حدود و تناسب کے اندر بندھی ہوئی ہے۔ ان کے مقاصد مجرم کی اصلاح و تادیب، خاص و عام روک تھام، معاشرتی نظم و ضبط کی حفاظت، متاثرہ کی دادرسی اور نظامِ سزا کی تکمیل ہیں۔ اسی لیے تعزیر کو اسلامی قانونِ سزا کا وہ عملی شعبہ کہا جا سکتا ہے جس نے اس نظام کو ہر دور میں قابلِ عمل رکھا۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اسلامی نظامِ سزا میں سختی و نرمی کا فیصلہ جذبات سے نہیں بلکہ جرم کی نوعیت و سزا کے مقصد سے ہوتا ہے، اور اس مقصد کا محور ہمیشہ اصلاح و انصاف رہتا ہے۔

سوال نمبر 5: اسلامی نظامِ عدالت میں احتساب کا تصور: کوئی قانون سے بالاتر نہیں (20 نمبر)

سوال نمبر 5: اسلامی نظامِ عدالت میں احتساب کا تصور ہر فرد پر لاگو ہوتا ہے اور کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ اس تصور کو بیان کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

احتساب اسلامی نظامِ حکومت و عدالت کے بنیادی تصورات میں سے ہے۔ اس کے لغوی معنی حساب لینا اور جواب طلب کرنا ہیں، اور اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ ہر صاحبِ اختیار و ذمہ داری اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے اور اس سے باز پرس ہو سکتی ہے۔ سوال میں اس تصور کی دو خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں: یہ ہر فرد پر لاگو ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے

میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ یہ دوسری خصوصیت دراصل قانون کی بالادستی کا دوسرا نام ہے، جس کے بغیر انصاف کا کوئی نظام مکمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر حکمران یا بااثر افراد قانون سے باہر ہوں تو عدالت کمزوروں کے لیے تو ہو گی مگر طاقت وروں کے لیے نہیں، اور ایسی عدالت آدھا انصاف ہی دے سکتی ہے۔ اس جواب میں احتساب کی بنیادیں، اس کے دائرے یعنی حکمران، قاضی، اہلکار و عام شہری، اس کے ادارے و صورتیں، اور اس کے معاشرتی اثرات کو بیان کیا جائے گا۔ یہ بحث علمی مطالعہ ہے؛ کسی شخص کے خلاف احتسابی کارروائی کا فیصلہ متعلقہ قانونی اداروں اور عدالتوں کا کام ہے۔

احتساب کی دینی و قانونی بنیادیں

احتساب کی جڑیں اس بنیادی عقیدے میں ہیں کہ ہر انسان اپنے اعمال کا جواب دہ ہے اور یہ جواب دہی دنیا سے شروع ہو کر آخرت تک جاتی ہے۔ اسی تصور کو قرآن مجید نے امانت و ذمہ داری کی زبان میں بیان کیا ہے کہ منصب ایک امانت ہے اور اس کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ نبوی تعلیمات میں یہ اصول بڑی وضاحت سے آیا ہے کہ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال ہو گا؛ حکمران اپنی رعایا کے بارے میں اور اہلکار اپنے شعبے کے بارے میں جواب دہ ہے۔ اس دنیوی احتساب کی سب سے مضبوط عملی بنیاد یہ احساس ہے کہ اخروی احتساب یقینی ہے، اس لیے صاحبِ اختیار ظاہر میں بچ بھی جائے تو اپنے ضمیر و عقیدے کی عدالت سے نہیں بچ سکتا۔ قانونی سطح پر اسی تصور سے یہ اصول نکلا کہ خلیفہ و حکمران بھی شریعت کا پابند ہے، اس کا حکم اسی حد تک نافذ ہے جس حد تک وہ حق کے مطابق ہو، اور اس کے خلاف بھی عدالت میں دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ یوں احتساب اسلامی نظام میں کوئی انتظامی سہولت نہیں بلکہ نظام کی دینی روح ہے۔

حکمران کا احتساب: تاریخ کی عملی صورتیں

احتساب کی سب سے بڑی آزمائش حکمران پر اس کے اطلاق کی صورت میں ہوتی ہے، اور اسلامی تاریخ کی ابتدائی ادوار اس کی روشن مثالوں سے بھرے ہیں۔ خلفائے راشدین عوام کے سامنے اپنے اعمال کا حساب پیش کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے کرتا و لباس کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کھلے عام وضاحت قبول کی، اور بیت المال کے استعمال میں وہ خود پر وہ سختی کرتے تھے جس کی عام آدمی سے توقع نہیں کی جاتی تھی۔ عدالت کے سامنے حکمران کی پیشی کی مثالیں بھی اسی اصول کی عملی صورت ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنی زرہ کے مقدمے میں قاضی شریح کے سامنے عام فریق کی حیثیت سے پیش ہونا اور گواہی ناکافی ہونے پر فیصلہ اپنے خلاف قبول کرنا احتساب و مساوات کی وہ مثال ہے جس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ قاضی کے سامنے خلیفہ بھی ایک مدعی سے زیادہ نہیں۔ بعد کے ادوار میں بھی یہ تصور زندہ رہا جس کی صورتوں میں حکمرانوں کا علماء و قاضیوں کی تنقید قبول کرنا اور مظالم کی سماعت میں عام شہری کی درخواست پر اہلکاروں کو طلب کرنا شامل ہے۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ احتساب اس نظام میں تقریری اصول نہیں تھا بلکہ عملاً نافذ تصور تھا۔

قاضی و اہلکاروں کا احتساب

احتساب کا دوسرا دائرہ خود عدلیہ و انتظامی اہلکار ہیں، کیونکہ انصاف دینے والا خود اگر جواب دہی سے آزاد ہو تو نظام اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ قاضی کے لیے فقہاء نے کڑی شرائط و آداب مقرر کیے ہیں: اس کی تقرری اہلیت کی بنیاد پر ہوتی ہے، وہ رشوت و ہدیے سے پاک رہنے کا پابند ہے، اس کے فیصلے ریکارڈ میں محفوظ ہوتے ہیں، اور اگر اس سے صریح نص کے خلاف فیصلہ یا بددیانتی ثابت ہو تو اسے معزول کیا جا سکتا ہے اور اس کا غلط فیصلہ کالعدم قرار پاتا ہے۔ خلیفہ و اولی الامر کی طرف سے قاضیوں کے خطوط و نگرانی اور عوامی شکایات کی سماعت اسی احتساب کی صورتیں تھیں۔ انتظامی اہلکاروں کے لیے بھی یہی اصول تھا: عامل و گورنر کے مال و آمدن کی نگرانی، اچانک اضافے پر سوال، اور شکایت پر تحقیق۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اہلکاروں سے ان کے مال کا حساب لینا اور اضافی مال بیت المال میں داخل کرنا اسی سلسلے کی مشہور مثال ہے۔ اس کے ساتھ حسبہ کا ادارہ بھی احتساب کی ایک منظم صورت تھا جس میں محتسب بازاروں، اوزان، قیمتوں و عوامی اخلاق و معاملات کی نگرانی کرتا تھا تاکہ چھوٹی سطح کی خلاف ورزیاں مقدمات بننے سے پہلے ہی رک جائیں۔

جدول 5: احتساب کے دائرے اور ان کی صورتیں

دائرہ	جواب دہی کی بنیاد	عملی صورت
حکمران	منصب امانت ہے؛ شریعت کی پابندی	عوامی وضاحت؛ عدالت میں پیشی

نگرانی، فیصلے کی جانچ، معزولی	فیصلہ دلیل و نص کے مطابق ہو	قاضی
حساب طلبی؛ شکایت پر تحقیق	عہدہ و مال کی دیانت	انتظامی اہلکار
اوزان و قیمتوں کی جانچ؛ فوری روک	بازار و عوامی معاملات کی نگرانی	محتسب و ادارے
عدالتی کارروائی و قانونی سزا	قانون کی پاسداری	عام شہری
خفیہ خلاف ورزی سے خود احتراز	اخروی جواب دہی کا یقین	فرد کا ضمیر

قانون سے بالاتر نہ ہونے کا اصول و اس کے اثرات

احتساب کا فطری نتیجہ وہ اصول ہے جسے آج قانون کی حکمرانی کہا جاتا ہے: قانون سب سے اوپر ہے اور کوئی فرد، خاندان یا ادارہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس اصول کے کئی عملی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پہلا اثر یہ ہے کہ کمزور شہری کو بااثر کے خلاف عدالت جانے کا حوصلہ ملتا ہے، کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا فریق قانون سے باہر نہیں نکل سکتا۔ دوسرا اثر بدعنوانی کی کمی ہے، کیونکہ جب ہر سطح پر سوال ہونے کا امکان موجود ہو تو اختیار کا غلط استعمال مہنگا ہو جاتا ہے۔ تیسرا اثر اداروں کا استحکام ہے: جس نظام میں سربراہ بھی جواب دہ ہو اس میں اختیارات شخصی خواہش کے بجائے اصولوں کے تابع رہتے ہیں اور نظام اشخاص کے آنے جانے سے نہیں ڈگمگاتا۔ چوتھا اثر عوامی اعتماد و شرکت ہے، کیونکہ جواب دہ نظام کو لوگ اپنا سمجھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جہاں احتساب منتخب ہو یعنی صرف کمزوروں کے لیے ہو، وہاں یہ تصور اپنا تقدس کھو دیتا ہے؛ اس لیے فقہاء و مفکرین نے ہمیشہ زور دیا ہے کہ احتساب کی ابتدا اوپر سے ہونی چاہیے، کیونکہ اوپر کی دیانت نیچے تک سرایت کرتی ہے اور اوپر کی خرابی بھی اسی طرح پھیلتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدالت میں احتساب سے مراد ہر ذمہ دار کی دنیوی و اخروی جواب دہی ہے جو حکمران سے لے کر قاضی، اہلکار اور عام شہری تک سب پر لاگو ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد امانت و جواب دہی کے دینی تصورات ہیں، اس کی عملی صورتوں میں حکمران کی عوامی وضاحت و عدالت میں پیشی، قاضی کی نگرانی و معزولی، اہلکاروں سے

حساب طلبی اور حسبہ جیسے ادارے شامل ہیں، اور اس کا مرکزی ثمرہ یہ اصول ہے کہ کوئی قانون سے بالاتر نہیں۔ یہی اصول عدل و مساوات جیسی خصوصیات کو صرف کتابی بات سے نکال کر عملی حقیقت بناتا ہے اور معاشرے کو استحکام عطا کرتا ہے۔ طالب علم کے لیے آخری نکتہ یہ ہے کہ احتساب کا یہ تصور مطالعے و سمجھنے کے لیے ہے؛ کسی بھی دور میں اس کی کارروائی صرف آئینی و قانونی اداروں کے ذریعے ہوتی ہے اور اسی میں نظام کی بھلائی ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com